ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT

JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL

Vol.9. No.2.2026

# نظریہ ترجمہ نگاری کے فکری, لسانی اور تہذیبی مظاہر: اردو اور ادبی تناظر میں لسانیاتی انتقالیت کا تنقیدی محاکمہ

## (Theoretical and Structural Manifestations of Translation Studies: A Critical Appraisal of Linguistic Translatability in Urdu and Literary Contexts)

***Amna Sibtain***
*MS Urdu Research Scholar, Department of Urdu, The Superior University, Lahore*
***Muhammad Osama Sarwar***
*MS Urdu Research Scholars, Department of Urdu, The Superior University, Lahore [amnasibtain29@gmail.com]*
***Professor Dr. Ata ur Rehman Mayo***
*Urdu Department, The Superior University, Lahore*

***Abstract***
*This study examines the theoretical, socio-linguistic, and cultural dimensions of translation, investigating the epistemic transitions between source constructs and target configurations. Rejecting the reductionist view of translation as mechanical lexical substitution, this research conceptualizes it as an existential hermeneutic phenomenon deeply embedded in historical and civilizational matrices. It explores the tripartite teleological paradigms of translation—informative, cultural, and aesthetic—with a specific focus on the challenges encountered during the textual transmutation of ideological, mystical, and theological discourses. By probing the ontological evolution of translation within Urdu literature, particularly through the historical trajectories of British institutional interventions and classical prose adaptations, this paper underlines the necessity of semantic equivalence over syntactic fidelity. Furthermore, it addresses the structural impediments in replicating metaphorical density and socio-semiotic idioms, emphasizing that a qualitative translation necessitates the re-creational autonomy of the translator.*

**Keywords:** *Translation Hermeneutics, Semantic Equivalence, Cultural Transmission, Rhetorical Sanctity, Intertextuality, Aesthetics of Translation.*

انسانی تمدن اور تہذیبی ارتقاء کی تسہیل میں جہاں متعدد عوامل متحرک رہے ہیں، وہیں یہ دعویٰ بھی قرینِ قیاس ہے کہ ثقافتی اقدار کے فروغ اور فکری شعور کی ترویج میں ترجمہ نگاری نے ایک کلیدی اور اساسی کردار ادا کیا ہے۔ نوعِ انسانی کے ارتقائی مراحل کا جب ہم غائر مطالعہ کرتے ہیں تو یہ حقیقت مبرہن ہوتی ہے کہ لسانیاتی اختلاط اور باہمی آمیزش کے باعث ایک انسانی گروہ نے دوسرے گروہ کے تجربات، مشاہدات، اور علمی فتوحات سے کماحقہ استفادہ کیا ہے، اور یہی وہ بنیادی نقطہ ہے جہاں سے ترجمے کی اہمیت و افادیت دوچند ہو جاتی ہے۔ کائناتِ انسانی میں بسنے والی آبادیاں ہر عہد میں متقدمین کے مشاہداتی و تجربی سرمائے کو اپنے لیے مشعلِ راہ بناتی رہی ہیں، لیکن ایک ایسا تاریخی موڑ بھی آیا جب انسانی معاشروں کو ہجرت اور انتقالِ مکانی کے پرپیچ مراحل سے گزرنا پڑا۔ اس جغرافیائی اور مکانی تبدیلی کے بعد نوعِ انسانی کے سامنے جو سب سے بڑا فکری مسئلہ نمودار ہوا، وہ متبادل آبادیوں میں مروجہ زبانوں کی تفہیم اور پھر اس نووارد انسانی گروہ کے فکری سرچشموں، تصورات، اور ذہنی رویوں تک رسائی حاصل کرنا تھا۔ کسی بھی معاشرے میں لسانیاتی بوقلمونی اور تغیر و تبدل ایک فطری امر ہے، چنانچہ ایک ہی ملک یا ریاست کی حدود میں زبانوں کا بدل جانا کوئی حیرت انگیز واقعہ نہیں ہوتا اور اس لسانی بعد پر چندماہ کی فکری کاوش سے قابو پایا جاسکتا ہے۔

اصل الجھن اور فکری مسئلہ یہ ہے کہ زبان محض مخصوص نحوی قواعد و ضوابط اور ساختیاتی پیمانوں کا مجموعہ نہیں ہوتی، بلکہ ہر زبان کے باطنی وجود اور رگ و پے میں اس مخصوص خطے کی تاریخ، تہذیبی جڑیں، اور نسلی تفاخر کے عناصر پیوست ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کسی بھی انسانی گروہ کے ادبی سرمائے اور لٹریچر کا مطالعہ کر کے ہم نہ صرف اس طبقے کی ذہنی ساخت اور نفسیاتی میلانات کا سراغ لگاتے ہیں، بلکہ اس قبیلے کی تاریخی جڑوں، تہذیبی ارتقاء، اور ذخیرۂ علم کے حقیقی سوتے تک رسائی حاصل کرتے ہیں۔ اس تناظر میں یہ

بات پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ انسانی آبادیوں کے باہمی اختلاط اور سماجی آمیزش نے ہی ترجمے کی ناگزیریت کا احساس بیدار کیا ہوگا، اور اس کارِ خیر کے سلسلے میں جو ابتدائی اور اسلوبیاتی کوششیں کی گئی ہوں گی، وہ یقیناً تجویز کردہ طریقوں کے مطابق نہایت کٹھن اور دشوار گزار مراحل سے گزری ہوں گی۔ اب جہاں تک اردو زبان وادب میں تراجم کی کلاسیکی روایت کا تعلق ہے، تو یہ امر نہایت افسوس ناک ہے کہ چند مخصوص اور انگشت شمار ادیبوں کے علاوہ، اردو کے اکثریتی اہلِ قلم نے ترجمے کی علمی اہمیت کا اعتراف کرنے کے باوجود اس پر باضابطہ اور سائنسی انداز میں کام کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ اس فکری جمود اور بے اعتنائی کے سلسلے میں ممتاز نقاد اور محقق **پروفیسر قمر رئیس** اپنے ایک گراں قدر مضمون میں اِس علمی صورتِ حال کا شکوہ کرتے ہوئے یوں **بیان کرتے ہیں** کہ:

**”جہاں تک اردو زبان میں ترجمہ کے آغاز وارتقاء، اس کے اصولوں اور نظریوں، اس کی مشکلات اور فتوحات اور اردو زبان و ادب پر ترجمہ کے نتیجہ خیز اثرات کا تعلق ہے، افسوس ہے کہ اس کے بارے میں وثوق سے کچھ کہنا مشکل ہے، اس لیے کہ اس صدی کے ابتدائی دہائیوں میں وحید الدین سلیم، مولوی عبد الحق، ظفر الرحمن دہلوی، اور میر حسن جیسے چند بزرگوں کے علاوہ اردو کے کسی ادیب اور عالم نے اس موضوع کو سنجیدہ مطالعہ اور علمی تحقیق کے قابل نہیں سمجھا۔ قدیم کلاسیکی عہد میں اردو شاعری کے سرمایہ سے قطع نظر نثر کی بیشتر کتابیں فارسی ادب کا ترجمہ ہیں؛ سب رس، کربل کتھا، نوطرز مرصع، باغ وبہار، گنج خوبی، آرائش محفل اور انیسویں صدی کی دوسری بے شمار داستانیں سب ترجمہ ہی سمجھی جاتی ہیں۔ لیکن یہ ترجمہ کس کس نوعیت کا ہے؟ اس کے پیچھے اگر کچھ اصول کچھ مقاصد کار فرما رہے ہیں تو وہ کیا ہیں؟ مترجم نے کہاں تک اصل سے دیانت داری برتی ہے؟ کہاں متن سے انحراف کیا گیا ہے؟ اگر آزاد ترجمہ ہے تو مترجم کے ذہن میں آزادی کا کیا مفہوم اور مقصود تھا؟ ان ترجموں نے کس طرح اور کس حد تک اردو زبان اور اردو نثر کے اسالیب کو متاثر کیا؟ یہ اور اس طرح کے دوسرے سوالات پر کسی عالم نے سنجیدگی سے غور وخوض کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی“[1]۔**

پروفیسر قمر رئیس کے ان تنقیدی خیالات اور فکری استدلال سے اختلاف کی کوئی گنجائش موجود نہیں ہے، کیونکہ فنِ ترجمہ نگاری کے معاملے میں ہماری یہ معاندانہ اور سرد مہرانہ بے اعتنائی روزِ روشن کی طرح عیاں ہے۔ حالانکہ ہم اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ اردو زبان وادب کی لسانی ترقی اور فکری بالیدگی میں سب سے کلیدی رول انہی ادبی و نثری تراجم کا رہا ہے جن کا ذکر پروفیسر صاحب نے اپنے اقتباس میں کیا ہے، یا پھر ان مذہبی والٰہیاتی تراجم کا ہے جن کا تفصیلی احاطہ آگے چل کر کیا جائے گا۔ جب برطانوی استعمار ہندوستان میں وارد ہوا، تو انہوں نے ہماری تہذیبی وثقافتی شناخت کو ملیامیٹ اور پامال کرنے سے قبل ہماری روایات کا نہایت غائر اور گہرا مطالعہ کیا، ہماری ادبی شناخت اور تمدنی معیارات کو پرکھا، اور ان تمام فکری رشتوں سے کماحقہ آگاہی حاصل کرنے کے بعد ہماری تہذیب وتمدن کی جڑوں کو کھودنا شروع کیا۔ تاہم، اس تاریخی حقیقت سے بھی کوئی ذی شعور انکار نہیں کر سکتا کہ انگریزوں نے اپنے مخصوص سیاسی و دفتری مقاصد کے تحت، نہ چاہتے ہوئے بھی اردو زبان کی لسانی اور نثری ترقی میں ایک غیر ارادی مگر اہم ترین خدمت سرانجام دی۔ یا یہ کہا جائے کہ ہمارے عالی مرتبت اکابرین نے انگریزوں کے استعماری مقاصد کو خود انگریزوں کے فائدے کے لیے کم، بلکہ اردو زبان کی ترویج، اشاعت اور ارتقاء کے لیے زیادہ استعمال کیا۔ لیکن یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ انگریزوں کے اسی استعماری عہد میں اردو زبان فکری اور اسلوبیاتی اعتبار سے توانا، مستحکم اور ثروت مند ہوئی، اور اس کی سب سے بڑی وجہ یورپی زبانوں اور مغربی علوم وادب کے وہ تراجم تھے جو بڑے پیمانے پر اردو کے قالب میں ڈھالے گئے۔ چنانچہ ہماری زبان، جس کے اندر مآخذ سے اخذ واستفادہ اور معنوی انجذاب کی صلاحیت بہ درجہ اتم موجود ہے، ان مغربی افکار کی شمولیت سے مالامال اور ثروت مند ہوتی چلی گئی۔

ترجمے کا لغوی اور اصطلاحی مفہوم صرف یہ نہیں ہے کہ ایک زبان کے لفظی ڈھانچے کو متبادل الفاظ کا ایک میکانیکی پیٹرن بنا کر دوسری زبان میں منتقل کر دیا جائے، بلکہ فنِ ترجمہ تو اس سطحی تفہیم سے بہت آگے کی چیز ہے۔ اس نازک فکری نکتے کی گہرائی کو واضح کرتے ہوئے مایہ ناز نقاد **پروفیسر محمد حسن** اس کی ناگزیریت اور ضرورت پر **روشنی ڈالتے ہیں** کہ:

**”ضرورت اکثر برائیوں کو اچھائیوں میں بدل دیتی ہے، ایسی ہی ایک برائی ترجمہ بھی ہے؛ ٹرانسلیٹر (Translator) کو ٹریٹر (Traitor) یعنی غدار (اور مترجم کو گندم نما جو فروش کہا گیا ہے۔ ترجمہ اگر اصل کا کام دینے لگے تو ترجمہ کیوں کہلائے، لازمی طور پر یہ اصل سے کمتر ہوگا۔ اور جو کمتر ہو وہ برائیوں میں کیوں نہ گنا جائے۔ مگر ضرورت کہتی ہے کہ عالمگیر آگہی کا نور اور سرور ایک زبان کے دامن میں تو سمٹنے سے رہا۔ جب تک ایک زبان کے بولنے والے دوسری زبانوں کے علم وآگہی، جذبے اور شعور، فکر واساس، تکنیک اور سائنس تک پہنچنا چاہیں گے، ترجمے کا سہارا لیں گے“[2]۔**

ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT



یعنی ترجمہ ایک ایسانادر فن ہے جو اپنی تمام تر ساختیاتی خامیوں اور لغوی حدود کے باوجود انتہائی اہم اور ناگزیر ہے۔اور یہ خامیاں اور ابلاغی رکاوٹیں بھی ایسی ہیں جن پر مکمل طور پر قابو پانا محال ہے۔ ترجمہ نگار جس لسانی مآخذ سے دوسری زبان میں منتقلی کا فریضہ سرانجام دیتا ہے، ظاہر ہے کہ ان دونوں زبانوں میں سے کوئی ایک ہی اس کی مادری زبان ہو گی۔ ہم اس حقیقت سے بھی شناسا ہیں کہ کسی بھی زبان کے الفاظ کے پسِ پشت ایک طویل تاریخی ارتقاء اور معنوی سفر ہوتا ہے، اور اس مخصوص معاشرے کی روایتیں، تہذیبی و سماجی انسلاکات، رسم و رواج، اساطیری و مذہبی واقعات کی ایک کثیر الجہت کائنات اس زبان کے محاورات، تشبیہات، استعارات، اور تلمیحات کی شکل میں یا پھر دیگر اشاراتی اور علامتی پیرائے میں داخل ہوتی ہے۔ ایسے تہذیبی اشاروں اور کنایوں کے حقیقی مفاہیم کو من و عن اور جوں کا توں دوسری زبان میں منتقل کرنا نہ صرف ایک کٹھن عمل ہے، بلکہ بسا اوقات ناممکنات میں سے ہو جاتا ہے، الا یہ کہ مترجم کو ہدف زبان پر بھی ویسا ہی خلاقانہ اور ماہرانہ عبور حاصل ہو جیسا کہ اسے اپنی مادری زبان پر حاصل ہوتا ہے۔

ترجمہ کرتے وقت متن میں قطع و برید اور کانٹ چھانٹ کرنا اگرچہ ادبی دیانت داری کے اصولوں کے منافی تصور کیا جا سکتا ہے، لیکن یہ بات بھی اپنی جگہ مروجہ علمی اصولوں کے مطابق درست ہے کہ کسی بھی زبان کے ادبی شاہکار اور شہ پارے کو دوسری زبان میں من و عن بیان کرنا ایک نہایت پیچیدہ اور محال امر ہے۔ کیونکہ یہاں مترجم کی محض لسانی قدرت ہی اہمیت نہیں رکھتی، بلکہ دونوں زبانوں کے ثقافتی پس منظر اور کلچر سے بھی اسے اسی طرح گہرائی میں واقف ہونا چاہیے جس طرح اصل مصنف واقف رہا ہے۔ ترجمے کے دوران منشائے مصنف اور اس کے فکری محرکات پر گہری نظر رکھنا واجب ہے، لیکن اس مقام پر ایک بڑا فکری بعد یوں سامنے آتا ہے کہ مصنف اور مترجم کے درمیان زمانی اور تاریخی فاصلہ کتنا ہے؟ اور کیا مترجم، مصنف کے ملک اور معاشرے میں رونما ہونے والے تاریخی تغیرات، المیوں اور سانحات سے اسی طرح باخبر ہے؟ کہا جاتا ہے کہ دنیا کے عظیم ترین ادبی شاہکار بنیادی طور پر مذہبی اور الٰہیاتی نوعیت کے رہے ہیں۔ اب ایسی صورت میں یہ کیونکر ممکن ہے کہ مترجم بھی مصنف کے مذہب، عقیدے اور مسلک کو اپنے باطن میں اسی طرح انگیز کیے ہوئے ہو اور ان بنیادی عناصر کو پیش نظر رکھ کر ترجمہ کرے جن کو بنیاد بنا کر مصنف نے وہ شہ پارہ تخلیق کیا تھا؟ محاورات اور روزمرہ کے استعمال کے سلسلے میں بھی مترجم کو ایک شدید ذہنی اور لسانی پریشانی لاحق ہوتی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ کسی بھی زبان میں رائج محاورے کا رشتہ اس معاشرے کی اجتماعی نفسیات سے بہت گہرا ہوتا ہے، اور یہ محاورے اور ضرب الامثال صدیوں کے صوتی اور معنوی رگڑ کے بعد گھس کر زبان زدِ خاص و عام ہوتے ہیں۔ ایسے میں دوسری زبانوں میں ان کے عین مطابق متبادلات یا ہم پلہ مترادفات کا کھوج لگانا نہ صرف مشکل بلکہ ناممکن ہو جاتا ہے۔ ہر زبان میں فصاحت اور بلاغت کے معیارات بھی الگ ہوتے ہیں، اور ان کے صنائع بدائع اور تشبیہاتی نظام بھی ایک دوسرے سے یکسر مختلف ہوتے ہیں۔ ان تمام لسانی لوازمات کو بروئے کار لا کر ترجمہ کرنا اپنے آپ میں ایک کارِ دارد ہے، اور اکثر و بیشتر مترجم کو ان فنی لوازمات کو نظر انداز بھی کرنا پڑتا ہے۔ لیکن ان تمام ساختیاتی اور ابلاغی مشکلات کے باوجود، اس نوع بنوع بدلتی ہوئی دنیا میں، جہاں جغرافیائی سرحدیں بے معنی ہو چکی ہیں اور دنیا ایک سرے سے دوسرے سرے تک ایک عالمگیر قصبے (Global Village) کی صورت اختیار کر چکی ہے، ترجمے کی علمی اور تجارتی اہمیت روز بروز دوچند ہوتی جا رہی ہے۔

اس فکری اور عالمی تبدیلی کے اثرات کا نقشہ کھینچتے ہوئے نامور مفکر **پروفیسر محمد حسن** اپنی علمی بصیرت کا اظہار کرتے ہوئے یوں **رقمطراز ہیں** کہ:

**”اس میں کوئی شک نہیں کہ آج جب دنیا کی طنابیں کھینچ رہی ہیں اور علم عالمگیر سطح پر ایک اکائی بنتا جا رہا ہے، کوئی زبان بھی ترجمے کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی کہ جب تک نئے خیال کا خون اور نئی آگہی کا نور رگ ریشے میں سرایت نہ کرے زندگی دشوار ہے۔ یہی نہیں بلکہ آج کی دنیا میں زبانوں کی مقبولیت کا پھیلاؤ اور اہمیت کا دارومدار بڑی حد تک ان کے مفید ہونے پر ہے۔ اور افادیت کا پیمانہ یہ ہے کہ کوئی زبان اپنے زمانے کے علمی سرمائے اور ادبی ذخیرے کو کس حد تک اپنے پڑھنے والوں تک پہنچانے کی اہل ہے۔ اردو زبان کی خوش بختی ہے کہ اس نے ترجموں کی روایت کو ابتداء ہی سے اپنایا۔ اپنے دریچے باہر سے آنے والی ہواؤں کے لیے کھولے۔ اور بین الاقوامی کلچر کے نقوش سے اپنی محفل کو آباد کیا۔ اس دور تک آتے آتے وہ پرانی روایت بھی ناکافی ہو گئی اور نئی دنیا کے تہذیبی سیاق وسباق نے برق رفتاری کے ساتھ ترجمے کے کام کو پھیلانے کو ناگزیر بنا دیا“[3]۔**

دراصل ترجمہ نگاری چراغ سے چراغ جلانے کے ایک متواتر اور مسلسل عمل کا نام ہے۔ ترجمہ ہی وہ واحد فکری ذریعہ ہے جس کے سبب ایک زبان کی فکر، اس معاشرے کی ثقافت، سیاسی و سماجی احوال، اور مذہب یا مسلک کے توسط سے قائم ہونے والی تعبیرات دوسری زبان کے لسانی قالب میں منتقل ہو جاتی ہیں، اور اس ہدف زبان کو پڑھنے والا ایک کثیر انسانی گروہ دوسری زبان کے گروہ کے افکار اور تہذیب کے بارے میں تفصیلی اور مستند معلومات حاصل کر لیتا ہے۔ مثال کے طور پر، اگر قدیم یونان کے عبقری اذہان، جیسے

ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT



سقراط اور افلاطون کی دوہزار سالہ پرانی فکری کاوشیں اور فلسفیانہ متون عربی زبان کے قالب میں منتقل ہو کر دنیا کے سامنے نہ آتے، تو ہم ان نابغۂ روزگار شخصیات کے افکار اور شہہ پاروں سے کبھی واقف نہ ہو پاتے۔ بالکل اسی طرح، اگر بو علی سینا، ابن رشد، اور ابو نصر فارابی کے سائنسی اور فلسفیانہ کارناموں کو لاطینی زبان میں منتقل نہ کیا جاتا، تو تاریخ اور فلسفے کا ایک بہت بڑا اور درخشاں باب ہمیشہ کے لیے انسانیت کی نظروں سے اوجھل رہتا۔ نامور محقق اور ادیب **ڈاکٹر جمیل جالبی یوں بیان کرتے ہیں** کہ:

**”ترجمہ صرف ایک زبان کے الفاظ کو دوسری زبان کے الفاظ سے بدل دینے کا نام نہیں ہے، بلکہ ایک تہذیب کے فکری اور جذباتی رویوں کو دوسری تہذیب کے مزاج میں منتقل کرنے کا تخلیقی عمل ہے۔ عجلت پسندی اور لغوی غلامی ترجمے کے اسلوب کو مسخ کر دیتی ہے“[4]۔**

ترجمہ اپنے وجود میں بذاتِ خود ایک مستقل فن ہے اور جس ہدف زبان میں اسے منتقل کیا جا رہا ہو، یہ اس کی لسانی توسیع، لغوی ثروت اور فروغ میں بھرپور معاونت کرتا ہے۔ یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ مترجم دورانِ ترجمہ بہت حد تک ماخذ زبان میں موجود محاورات، تشبیہات، اور استعارات کو اپنے طور پر دوسری زبان میں داخل کرنے کے لیے نئی نئی اصطلاحات وضع کرتا ہے، جو ابتدا میں اگرچہ غیر مانوس اور اجنبی معلوم ہوتی ہیں، لیکن رفتہ رفتہ ان کو اہل زبان کی سندِ قبولیت حاصل ہو جاتی ہے اور وہ روزمرہ کا حصہ بن جاتی ہیں۔ ترجمے کے دوران یہ لسانی اضافے اور معنوی وسعتیں خود بخود رونما ہوتی ہیں، جس سے ہدف زبان کا دامن وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس تاریخی اور علمی سفر پر بحث کرتے ہوئے **پروفیسر محمد** حسن علم کی اس آفاقی ہجرت کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے یوں **رقمطراز ہیں** کہ:

**”ترجمے کے ذریعے علم انسانی میں اضافہ کرنے والوں کا قافلہ بڑا شاندار ہے اور بہت طویل ہے۔ اس میں بڑے بڑے حلقے ہیں۔ اگلے سرے پر بو علی سینا، درمیان میں والیٹئر موجود ہیں تو پچھلے سرے پر ڈاکٹر ذاکر حسین اور پسترناک؛ عرب و عجم کے علماء نے یونانی ہندوستانی فلسفہ، طب، ہیئت و نجوم اور داستانوں کا عربی میں ترجمہ کر کے ان پر اپنی معلومات کے حاشیے چڑھا کر علمی دنیا سے خراج پایا۔ لاطینی و روسی کے ذریعہ مشرق کو اور سنسکرت کے تراجم کے ذریعہ مغرب کو اپنے زمانے تک کی تحقیقات سے باخبر کر دیا۔ پھر زمانے نے کروٹ لی۔ والیٹئر نے شکسپیئر کا ترجمہ کر کے فرانسیسی زبان کے ذخیرے میں اور پسترناک نے روسی زبان کے ادب میں بیش بہا اضافے کیے اور خود اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ علمائے مستشرقین نے مشرق کے کلاسیکی ادب اور علمی کتابوں کو مغرب سے روشناس کرایا۔ اس دوطرفہ عمل نے مشرق و مغرب کی طنابیں کھینچ دیں۔ اور باہمی خیر و خبر کی گنگا دونوں سمتوں میں بہنے لگی“[5]۔**

یعنی اقوامِ عالم کے مابین باہمی رفاقت، فکری جڑت اور سفارتی و ثقافتی روابط میں اضافے کی بنیادی کڑی دراصل یہ تراجم ہی ہیں۔ ہم آج اگر عالمگیر تاریخ اور بین الاقوامی علوم سے واقفیت پر فخر کرتے ہیں، تو اس کا ایک بڑا سبب یہی ہے کہ ابتدا ہی سے ہمارے دانشوروں اور اکابرین نے ترجمے کی اس عظیم روایت کو زندہ رکھا، اور پوری دنیا کے نادر و نایاب فکری خزانوں کو ہماری زبان میں منتقل کر کے ایک گرانقدر سرمایہ فراہم کر دیا۔ تراجم کے ذریعے نہ صرف یہ کہ دوسری زبانوں کے افکار و خیالات سے آگاہی حاصل ہوتی ہے، بلکہ اس ماخذ زبان میں مروجہ اسلوب، ہیئت اور ادبی اصناف سے بھی ہدف زبان مستفید اور فیض یاب ہوتی ہے۔ اخذ و استفادے کا یہ متحرک عمل اس قدر مقبول اور مستعمل ہے کہ اردو زبان میں اس کے بے شمار اور متمول نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ نثر ہو یا شاعری کا کثیر سرمایہ، وہ تمام اصناف جن کی بنیاد پر اردو ادب قائم و دائم ہے، وہ بنیادی طور پر دوسری زبانوں کے ہجرتی اثرات کے تحت ہی ہماری زبان میں وارد ہوئی ہیں۔ اب ان میں سے بہت سی اصناف ایسی تھیں جو اخذ و استفادے کے باوجود ہمارے یہاں جڑیں نہ پکڑ سکیں اور رائج نہ ہو پائیں، لیکن کچھ اصنافِ سخن ایسی بھی آئیں جنہوں نے ہماری زبان کی آبرو اور شعری شناخت کی حیثیت اختیار کر لی۔ غزل کی کلاسیکی مثال ہمارے سامنے ہے جو فارسی کے توسط سے ہوتی ہوئی ہمارے یہاں پہنچی، لیکن یہاں کے مقامی "دوہے" سے الگ رہ کر اس نے ایسی بے پناہ پذیرائی حاصل کی کہ اردو غزل کا دامن وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ بہت سارے اساتذہ شعراء نے فارسی زبان میں طبع آزمائی اور غزل گوئی کو ترک کر کے اردو میں غزل کہنا شروع کر دیا۔ حکیم اسد اللہ خان غالب اس کی ایک روشن اور بین مثال ہیں۔ ظاہر ہے کہ غالب نے فارسی زبان پر ماہرانہ عبور حاصل کیا تھا اور وہ اپنے فارسی کلام پر نازاں بھی تھے، لیکن انہوں نے جب اپنی مادری زبان اردو میں شاعری کی تو اسے وہ دوام اور کمال حاصل ہوا جو غالب کے کلامِ فارسی کو بھی میسر نہ ہو سکا تھا۔ اب غالب کے کلام کی این آفاقی پذیرائی صرف اس لیے ممکن ہوئی کہ وہ فارسی زبان میں غزل کی کلاسیکی روایت سے کماحقہ واقف تھے، انہوں نے اس روایت میں نئے فکری اضافے کیے اور اس کے معنوی دامن کو وسعت دی۔ اس نازک شعری منتقلی کے حوالے سے نامور ساختیاتی نقاد **ڈاکٹر گوپی چند نارنگ** شعری ابلاغ کی اس نازک منتقلی کے فنی پہلو کو اِسی نوعیت سے **وضاحت کرتے ہیں** کہ:

**"ادبی اور شعری متون کا ترجمہ اس وقت تک باوقار اور موثر نہیں ہو سکتا جب تک مترجم ماٰخذ زبان کے تہذیبی تلازمات اور ہدف زبان کی لسانیاتی لچک پر یکساں قدرت نہ رکھتا ہو۔ شعر کا ترجمہ محض نثر کا خلاصہ نہیں، اس کے باطنی آہنگ کی بازآفرینی ہے"[6]۔**

تراجم کی اپنی ایک قدیم تاریخ اور مستحکم روایت ہے، لیکن اس پورے منظر نامے میں ادبی تراجم کو خاص اور امتیازی اہمیت یوں حاصل ہے کہ ادبی سرمائے میں ایک مخصوص عہد کے تمام سماجی, سیاسی اور ثقافتی لوازمات بدرجۂ اتم موجود ہوتے ہیں۔ ادبی تراجم میں اگر ہم صرف نثری کائنات کا ذکر کریں، تو اندازہ ہو گا کہ "الف لیلہ" کے ترجمے سے ہی ہماری زبان میں فکشن اور داستانی کہانیوں کا کتنا بڑا اور طویل سلسلہ قائم ہو گیا۔ اور پھر ناول یا افسانہ نگاری تک، مغربی ناولوں اور شارٹ اسٹوریز کے تراجم نے جو فکری و اسلوبیاتی انقلاب برپا کیا، اس کی مثالیں دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ تراجم کے ہی کارناموں کی بدولت ہم نے روس، انگلینڈ، اور امریکہ ہی نہیں بلکہ ایران اور عرب کے طرزِ معاشرت، تہذیبی اقدار اور خاندانی نظام سے بھی آگاہی حاصل کی۔ ترجمے کی یہ تاریخ جتنی قدیم ہے، اتنی ہی معتبر ہے، اور اسے ہمارے ماہرین نے باضابطہ ایک مستقل فن کا درجہ دے رکھا ہے۔
لیکن فنِ ترجمہ نگاری ایک ایسا نازک فن ضرور ہے جس کے معیارات کے حتمی تعین کے لیے کوئی جامد اور آخری اصول مقرر نہیں کیا جا سکتا، یہی وجہ ہے کہ اس فن کی حقیقی قدر و قیمت اور جمالیاتی سطح کا ٹھیک سے جائزہ لینا ایک مشکل امر ہو جاتا ہے۔ ماہرین اگر بطور خاص اردو زبان میں ترجمے کی روایت کے شاکی اور گلہ مند ہیں، تو وہ صرف اس لیے کہ ہمارے یہاں شعری اور نثری سرمائے کی طرح ترجمہ نگاری کے اصول وضوابط باضابطہ طور پر مدون اور مقرر نہیں کیے گئے ہیں۔ جس سے ایک بڑی علمی خرابی یہ پیدا ہوئی کہ ہمارے تراجم کے ذخیرے میں بہت سی مایہ ناز چیزوں کے ساتھ ساتھ کچھ نہایت ناقص اور خراب ترجمے بھی شامل ہو گئے۔ جب تک کسی بھی فن کے ارتقاء کے لیے کوئی احتسابی اصول اور تنقیدی پیمانہ مقرر نہ کیا جائے، اس فن کی اہمیت و افادیت اور جمالیاتی قدر میں اضافہ ممکن نہیں ہوتا۔ یہی سبب ہے کہ دیگر ترقی یافتہ زبانوں کے مقابلے میں اردو وہ زبان ہے جس میں عالمی معیار کے مترجمین کی کوئی طویل فہرست قائم نہیں ہو سکی۔ انگریزوں نے فورٹ ولیم کالج کے قیام سے اس کی شروعات ضرور کی تھی اور اس کے نتیجے میں اردو زبان وادب کے دامن میں چاند ستارے بھی ٹانکے گئے، لیکن ایک خاص تاریخی عہد کے بعد ترجمے کی اس علمی اہمیت کو پسِ پشت ڈال دیا گیا، اور نتیجہ یہ ہوا کہ زبان میں جس تیزی سے وسعت آرہی تھی، اس کی رفتار سست پڑ گئی۔ ایک بڑی وجہ یہ بھی رونما ہوئی کہ ہم رفتہ رفتہ اپنی کلاسیکی علمی روایت سے دور ہوتے چلے گئے، اور بطور خاص اردو زبان کے لسانی تعلقات جن خاص زبانوں یعنی عربی اور فارسی سے استوار تھے، ہم نے نئی نسلوں کو ان زبانوں کی تعلیم دینا ہی ترک کر دیا؛ نتیجہ یہ ہوا کہ جتنی ترقی زبانِ اردو کو ہونی تھی ہو چکی اور اس میں کسی نئے کلاسیکی ماٰخذ سے اضافے کی اب کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ اگر ترجمے کی اس روایت کو زندہ اور باقی رکھا جاتا، تو آج اردو کا دامن جس قدر وسیع ہے، اس میں خاطر خواہ اور انقلابی اضافہ ہو چکا ہوتا۔
ترجمہ کرتے وقت مترجم کسی بھی ادب پارے سے جو معنی، تعبیر یا فکری مفہوم اخذ کرتا ہے، قاری تک بنیادی طور پر اسی کی ترسیل ہوتی ہے؛ اب منشائے مصنف حقیقت میں کیا ہے، اسے پانے کے لیے اصل متن اور متن کی ماٰخذ زبان کا گہرا مطالعہ ناگزیر ہو گا۔ منشائے مصنف کے سلسلے میں یہ لسانیاتی بحث بھی دہرائی جاتی ہے کہ الفاظ کے اپنے کوئی مستقل اور قائم بالذات معنی نہیں ہوتے، بلکہ الفاظ کو حقیقی معنی ان کا پورا معنوی سیاق وسباق (Context) عطا کرتا ہے۔ یہ لسانیاتی نظریہ بنیادی طور پر قدیم ہندوستانی مفکر بھرتری ہری کی فکر سے ماخوذ ہے، اور بعد میں اسی فکری خیال کو فرانسیسی فلسفی ژاک دریدا نے اپنے نظریۂ ردِ تشکیل (Deconstruction) میں نئے لفظی پیرائے کے ساتھ دہرایا ہے۔ ترجمہ نگاری کے میدان میں یہ بات اکثر سامنے آتی ہے کہ مترجم، منشائے مصنف کے ساتھ مکمل طور پر انصاف نہیں کر پاتا، یا پھر ترجمہ کرتے وقت مترجم سورس لنگویج (ماٰخذ زبان) کی بہت سی ثقافتی باریکیوں کو ٹارگیٹ لنگویج (ہدف زبان) میں منتقل کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ اس ابلاغی نقصان اور لغوی پیچیدگی کا احاطہ کرتے ہوئے **پروفیسر ظہور الدین** اپنے پُر علم خیالات کا اظہار اِس انداز میں **بیان کرتے ہیں** کہ:

**"ایک عام پڑھے لکھے انسان سے اگر یہ سوال کیا جائے کہ ترجمہ کیا ہے تو وہ فوراً جواب دے گا کہ کسی ایک زبان کی تحریر کو دوسری زبان میں ہو بہو منتقل کرنے کا نام ترجمہ ہے۔ لیکن کیا یہ جواب اس طالب علم کی تشفی کے لئے کافی ہے جو ترجمے کا مطالعہ ایک ایسے فن کے طور پر کر رہا ہے جس کی صرف فنی وجمالیاتی ہی نہیں فلسفیانہ جہتیں بھی ہیں۔ وہ جانتا بھی کہ ترجمہ محض تبادل الفاظ تلاش کرنے کا نام نہیں یہ اس سے کہیں زیادہ پیچیدہ، اور انکشافاتی علم کا اعلامیہ ہے"[7] ۔**

دراصل ترجمے کا فن اپنے آپ میں ایک ایسا خلاقانہ عمل ہے جس کے ذریعے مترجم نہ صرف یہ کہ کسی شاہکار کے اصل لسانی قالب کو دوسری زبان کے قالب میں منتقل کرتا ہے، بلکہ وہ خود بھی ایک تخلیق کار اور مصنف کے مرتبے پر فائز ہو جاتا ہے اور اس شہہ پارے کو از سرِ نو دوبارہ تصنیفی اور تخلیقی مراحل سے گزارتا ہے، اور بسا اوقات وہ اپنے

ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT

JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL

Vol.9. No.2.2026

اسلوبیاتی کمال سے اصل شاہکار سے بھی بہت آگے نکل جاتا ہے۔ اس باریک نکتہ کو سمجھنے کے لیے زمانی انقلابات اور تاریخی تغیرات پر نظر رکھنے کی شدید ضرورت ہوتی ہے۔ ایک شہ پارہ جو ایک صدی قبل یا اس سے بھی پہلے تصنیف کیا گیا ہو اور اس ادبی شہ پارے کا مصنف کسی دور افتادہ، پسماندہ یا غیر ترقی یافتہ علاقے کا باشندہ ہو، لیکن ایک صدی بعد جب کسی جدید اور ترقی یافتہ ملک کے کسی بڑے صنعتی شہر کا مترجم اسی شہ پارے کو ترجمے کے لیے منتخب کرے گا، تو اس کے سامنے نہ صرف یہ کہ ایک صدی بعد تک کا انسانی تجربہ ومشاہدہ ہوگا، بلکہ روز بروز بدلتی کرتی ہوئی دنیا کا باشندہ ہونے کے ناطے وہ مترجم اپنے انکشافاتی تجربے کے باعث اس شہ پارے کے مفاہیم کو فطری طور پر اور آگے لے جائے گا۔ اس مترجم کے سامنے ترجمے کے دوران معاصر عہد کے قاری کا ذہنی معیار، ان کی پسند ناپسند کا جدید پیمانہ موجود ہوگا۔ اور اسی لیے وہ ترجمے کے وقت مصنف کے شہ پارے کو پھر سے تصنیف (Re-create) کرے گا، یا ترجمے کے عمل کے دوران ہی وہ شہ پارہ خود بخود ہی دوبارہ تخلیق کے مرحلے سے گزر جائے گا۔ شرط صرف یہ ہے کہ مترجم کے باطن میں ایک تخلیق کار اور مصنف بھی بیدار ہو۔ یہی وہ بنیادی وجہ ہے جس کے باعث یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ ایک اہل اور کامل مترجم بیک وقت نہ صرف مترجم ہوتا ہے، بلکہ ایک مصنف، تخلیق کار اور نبض شناس محقق بھی ہوتا ہے۔ الٰہیاتی اور تقدس مآب متون کے اس نازک ابلاغی پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے ممتاز عالم **ڈاکٹر فرمان فتح پوری** اِس بلاغتی تقدس کے بارے میں یوں **وضاحت کرتے ہیں** کہ:

**"مقدس اور الٰہیاتی متون کے ترجمے میں لفظی جکڑبندی بسا اوقات اصل مفاہیم کے ابلاغ میں سدِراہ بن جاتی ہے۔ مترجم کا اصل کمال یہ ہے کہ وہ متن کے تقدس اور بلاغت کو مجروح کیے بغیر اسے معنوی گہرائی کے ساتھ منتقل کرے"[8]۔**

اس خلاقانہ منتقلی اور اصطلاحی صیانت کے علمی آداب پر بحث کرتے ہوئے نامور اسکالر **ڈاکٹر عبد الحق نعیمی** اپنے ایک کثیر الجہت تحقیقی مضمون "فن ترجمہ نگاری" میں اس فن کی تہیں کھولتے ہوئے یوں **بیان کرتے ہیں** کہ:

"ترجمہ کی خاصیت یہ ہے کہ وہ اصل عبارت کے ساتھ ہی ساتھ مصنف کے نظریات، معتقدات، تصورات واحساسات کی صحیح ترجمانی بھی کرے۔ اصل متن کی روح اسی طرح برقرار رہ سکتی ہے۔ یہی ترجمانی ہے جس میں محض لفظی ترجمہ اور ترجمانی کا فرق واضح ہو کر سامنے آتا ہے، ترجمانی ترجمہ سے دشوار اور نازک تر کام ہے۔ ترجمہ ایک باقاعدہ اور مستقل فن ہے اس کے اپنے مخصوص ضابطے ہیں۔ ترجمے کے فن میں مہارت کے لئے دوسرے فنون کی طرح شوق وصلاحیت کے ساتھ ہی ساتھ تربیت وریاضت کی بھی ضرورت ہے۔ ترجمہ محنت طلب کام ہے ایک طرف وہ سنجیدگی کا مطالبہ کرتا ہے تو دوسری طرف اس فن کے اصولوں سے واقفیت کا۔ اس فن کو برتنے اور اس میں مہارت پیدا کرنے کے لئے چند زبانوں کا جاننا بھی ضروری ہے۔ نہیں تو کم از کم دو زبانوں کی ساخت، تلفظ، ادبیات اور معانی وبیان پر مہارت تامہ ہونا لازمی ہے۔ دونوں زبانوں کے مزاج کی تہذیبی فضا کو پہچاننا بھی ضروری ہے۔ جس زبان میں ترجمہ کرنا ہو اس کے محاورات ومترادفات اور لغات، اصطلاحات پر ماہرانہ عبور اور قدرت از بس ضروری ہے۔ بالفاظ دیگر مترجم کے لئے ضروری ہے کہ اصل متن کے پس منظر سے پوری واقفیت حاصل کرے ترجمے کا اصل مقصد مفہوم کی مناسبت ادائیگی ہے۔ الفاظ کا صحیح استعمال بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ مترجم کی کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ وہ باطبع ذہن ہو اور اس نے متن کی اصل روح کو پالیا ہو۔ اور پھر اصل کو اپنے ذہن کے مطابق نئے قالب میں ڈھالنے پر قادر ہو۔ ترجمے میں تخلیق کو از سر نو پیدا کرنا ہوتا ہے۔ گویا ترجمہ نگار کے ذریعہ تخلیق کو از سر نو (recreate) دوبارہ تخلیق کیا جاتا ہے"[9]۔

یہ بات بالکل واضح ہونی چاہیے کہ ترجمہ ایک ایسا فن ہے جس میں ایک زبان کے مفردات کے متبادل کے طور پر دوسری زبان کے لغوی الفاظ کا جان لینا ہی کافی نہیں ہے، بلکہ اس متن کی اصل روح یعنی مفہوم یا منشائے مصنف تک رسائی حاصل کرنا زیادہ اہم اور ناگزیر ہے۔ کیونکہ یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ مترجم جس متن کا ترجمہ کر رہا ہو، اور جس ہدف زبان میں ترجمہ کر رہا ہے، اس زبان میں ہو بہو مترادفات اور متبادل الفاظ ومحاورے دستیاب ہوں۔ جرمن فلسفی شوپنہار نے یہ بات کہی تھی کہ کسی بھی ایک زبان کے مفردات کی ہو بہو اور عینی نقل دوسری زبان میں بھی مل جائے، یہ ناممکن ہے۔ کسی حد تک شوپنہار کا یہ فکری خیال حقیقت پر مبنی بھی ہے، کیونکہ زبان اپنے ساتھ تمام تر سماجی اور تہذیبی عوامل کو ساتھ لے کر بنتی ہے؛ اس معاشرے میں رائج مذہبی اعتقادات، مسالک، افکار اور اساطیر کی چھوٹ سے ہی زبان کے دامن میں نکھار پیدا ہوتا ہے اور اسے سماج میں رواج ملتا ہے۔ لیکن ان سب کے باوجود معانی اور مفاہیم کا اگر ترجماتی تجربہ کیا جائے تو اسکالرز کے نزدیک اس میں کوئی قباحت یا علمی عیب موجود نہیں۔ یہ بات ہم سب جانتے ہیں کہ ساری دنیا کے انسانی ٹولوں اور قبیلوں میں کچھ بنیادی باتیں یقیناً مشترک ہیں؛ جن میں خوشی وغم کا آفاقی احساس، رونا، ہنسنا، بھوک کا لگنا، ظلم اور اس کے خلاف احتجاجی رویہ، جنگ اور جنگ کی ہولناک تباہی، ظالم اور مظلوم کے درمیان ازلی کشاکش، منظر نگاری، قدرتی مناظر کا ذکر اور اس میں انسانی دلچسپی، خدا کا عالمگیر تصور اور زندگی کے بعد

ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT

JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL

Vol.9. No.2.2026

دوسری دنیا کا وجود، یہ سب وہ مشترکہ باتیں ہیں جو تقریباً ساری دنیا کے انسانوں میں یکساں پائی جاتی ہیں۔ ساری دنیا کے لوگ تہوار مناتے ہیں، یہ الگ بات ہے کہ کوئی کرسمس کو بڑا تہوار سمجھتا ہے تو کسی کے نزدیک دیوالی یا عید سعید بڑی خوشی کا دن ہوتا ہے۔ لیکن ان تمام متفرق اقوام میں خوشی منانے کا بنیادی تصور تو مشترک ہی ہے۔ ایسے میں ایک زبان میں کہی ہوئی بات کو دوسری زبان میں منتقل کرنا یوں آسان ہو جائے گا کہ ہم الفاظ کے بجائے مفاہیم تک رسائی حاصل کر لیں، تاکہ ہمارا قاری متن کے جوہر کو اپنی زبان میں نہ صرف محسوس کر سکے، بلکہ اس مفہوم کے ذریعے دیگر معاشروں اور اجنبی ثقافتوں کی جھلک بھی دیکھ سکے۔ جہاں تک سوال ہے مفہوم کو سمجھ کر ترجمہ کرنے سے کچھ لسانی چیزوں کے ضائع ہو جانے کا، تو بات پھر وہیں آجاتی ہے کہ کیا ہمارا مترجم دونوں زبانوں پر کامل اور خلاقانہ دسترس رکھتا ہے؟ اگر ایسا ہے، تو وہ صرف وہاں مجبور ہو گا جہاں بلاغت وفصاحت کے معیارات کا واضح فرق ہو گا، یا صنائع وبدائع، تشبیہات واستعارات کے پیمانوں کا بعد ہو گا۔ اگر مترجم دونوں زبانوں پر کامل دسترس رکھتا ہے، تو یقیناً وہ مفہوم کو پا کر اس تشبیہ یا استعارے کو اپنی زبان میں صراحت کے ساتھ منتقل کر دے گا اور بوقتِ ضرورت فٹ نوٹ کے طور پر اس استعارے کی تلمیحی تشریح بھی کر دے گا۔ اور اگر وہ ایسا نہ بھی کرے اور صرف اشارۃً اس کا ذکر کر دے، تب بھی قاری کے لیے مفہوم کا سمجھنا زیادہ مشکل نہیں ہو گا، کیونکہ اسے متن کا پچاس سے نوے فیصد حصہ تو ترجمے کی شکل میں دستیاب ہو ہی رہا ہے۔

دس یا پانچ فیصد کے اس لسانی نقصان کے باوجود آج ساری دنیا کو ایک عالمی گاؤں قرار دیا جا رہا ہے، اور ہم روز دنیا کے مختلف خطوں سے آئے ہوئے لوگوں سے ملتے بھی ہیں اور فکری گفتگو بھی کرتے ہیں۔ ایسے میں یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ ہم ان تمام ممالک سے آئے ہوئے لوگوں کی زبانوں پر کامل اور ماہرانہ دسترس حاصل کر لیں، لیکن ترجمے کے ذریعے ہی ہم ان کے معاشرے کو پڑھتے ہیں، ان کے رسم ورواج سے واقفیت حاصل کرتے ہیں، ان کی خوشیوں میں شریک ہونے کے طریقے اور غمزدہ ہونے کے انداز کو جانتے ہیں۔ یہاں تک کہ تراجم کے کمال سے ہی ان کے لباس، ان کے رہن سہن، اور ان کے کھانے پینے کے اسباب کی جانکاری حاصل کرتے ہیں اور یہ اہتمام کرتے ہیں کہ جرمنی سے آیا ہوا کوئی شخص ہندوستان یا پاکستان میں خود کو اجنبی محسوس نہ کرے۔ اس کے لیے اسے جرمنی جیسا ہی ثقافتی ماحول دینے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اہم بات یہ بھی ہے کہ اس طرح ہم ساری دنیا کو اپنا دوست بنا لیتے ہیں، ان کی کامیابیوں اور ناکامیوں سے سبق لیتے ہیں اور اپنی زندگی کی شاہراہ کو اس معاصر ماحول میں ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ترجمہ ہی وہ واحد طریقہ ہے جس کے ذریعے ہم اقوامِ عالم کی تاریخی صورتحال سے واقف ہوتے ہیں اور ماضی کے تجربات سے سبق حاصل کر کے اپنے مستقبل کو بناتے اور سنوارتے ہیں۔ اس تہذیبی ہجرت اور فکری انتقالیت پر روشنی ڈالتے ہوئے عالمی شہرت یافتہ نظریہ دان **سوزان باسٹ نیٹ** (**Susan Bassnett**) ترجمے کے اس تعبیری سفر کا محاکمہ کرتے ہوئے یوں **وضاحت کرتی ہیں** کہ:

**”ترجمہ کسی لسانی ساخت کے ضابطے کو کھول کر دوسری ساخت سے بدلنے کا نام نہیں، بلکہ یہ ایک عمیق تعبیری سفر ہے جہاں مترجم اصل متن کی روح کو ہدف زبان کی تہذیبی ساخت میں دوبارہ زندہ کرتا ہے“[10]۔**

اس تیز رفتار اور ترقی یافتہ دور میں دنیا جس برق رفتاری سے ترقی کی منازل طے کر رہی ہے، یہ اب کسی بھی قوم کے لیے ممکن ہی نہیں رہا کہ وہ اپنے اپنے معاشرے اور ملک کی جغرافیائی سرحدوں میں مقید اور محصور رہے۔ ایسے میں قومی ترقی کے لیے جہاں دیگر بہت سی مادی چیزوں کی ضرورت ہے، وہیں ہر معاشرے کو جدید اور ترقی یافتہ بنانے میں قابل مترجمین کا بہت بڑا اور انقلابی رول ہوتا ہے۔ قابل مترجمین سے مراد یہاں ایسے ماہرین سے ہے جو دونوں زبانوں کے باطنی مزاج اور لسانی ساخت کو اچھی طرح سمجھتے ہوں۔ جو ایک زبان میں کہی گئی بات کے فکری مفہوم کو دوسری زبان میں من وعن پیش کرنے کا ہنر جانتے ہوں، اور زبان کے قواعد اور ثقافتی فریم کو تبدیل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ دنیا کی ہر زبان میں یہ صلاحیت اور لچک موجود ہوتی ہے کہ اس کی مدد سے ہر فکری چیز اور ہر پیچیدہ مفہوم کی ادائیگی ممکن بنائی جا سکے، کیونکہ مفہوم کی سطح تک ہر زبان کے الفاظ اور مفردات میں اتنی لچک پائی جاتی ہے کہ ضرورت کے مطابق ان میں معنوی توسیع کی جا سکے، اور اپنے مفاہیم کی ادائیگی کے لیے نئی علمی اصطلاحات وضع کی جا سکیں۔ نئے افکار ومفاہیم کے لیے نئے الفاظ بنائے بھی جاتے ہیں اور پرانے الفاظ وتراکیب میں معنوی تبدیلیاں بھی کی جاتی ہیں۔ تذکیر وتانیث یعنی مذکر ومونث کا معاملہ بھی اسی وقت مترجم کے آڑے آتا ہے جب ہم لغوی اور لفظی ترجمہ کرنے بیٹھتے ہیں؛ جیسے ہی ہم دونوں زبانوں کے باطنی مزاج پر گرفت حاصل کرتے ہیں، یہ لسانی مسئلہ بھی خود بخود حل ہو جاتا ہے۔ جو لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ ترجمے کے وقت اکثر وبیشتر زبان کے ثقافتی کردار پر آنچ آتی ہے اور اصل متن کی جمالیاتی خوبصورتی ضائع ہو جاتی ہے، وہ لوگ دراصل زبان میں موجود صنائع بدائع کی بات کرتے ہیں؛ وہ تراکیب، تشبیہ اور استعارات کی جکڑبندی کی بات کرتے ہیں۔ لیکن یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ ترجمے

ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT



کا اصل اور بنیادی مقصد تو صرف یہی ہے تاکہ ایک نامعلوم زبان کی چیزیں، افکار، خیالات اور تجربی علوم کو معلوم زبان کے دائرے میں داخل کر دیا جائے، اور اس مقصد کے حصول کے لیے مترجم کا ان دونوں زبانوں پر علمی عبور کافی ہے۔ رہا سوال صنائع بدائع اور فصاحت وبلاغت کا، تو اس کے لیے ماہر مترجم کی شرط بھی یہی ہے کہ وہ محض ایک لغوی مترجم نہیں ہوتا بلکہ ایک مصنف اور تخلیق کار بھی ہوتا ہے۔ اب اگر وہ ان تخلیقی خصوصیات کا حامل نہیں ہے اور اس کی نظر دونوں زبانوں کے اسلوبیاتی نظام پر گہری نہیں ہے، وہ ان زبانوں کی نزاکتوں سے واقف نہیں ہے، اور قواعد وضوابط کا جانکار نہیں ہے، تو یہ خامیاں اور غلطیاں مترجم کی ذات کی ہیں؛ ترجمے کی افادیت اور اس کے فن سے اس خامی کا کوئی تعلق کیونکر قائم ہو سکتا ہے؟ مثال کے طور پر، اردو زبان میں شاعری کو غزل کے پیمانے سے ماپا جاتا ہے، اردو میں بڑے بڑے غزل گو شعراء ہر دور میں پیدا ہوتے رہے ہیں جنہوں نے غزل کو بامِ عروج تک پہنچایا ہے۔ لیکن کیا ہر دور میں ہلکی اور سطحی غزل کہنے والے شعراء موجود نہیں رہے؟ کیا ہر دور کے دو چار عظیم غزل گویوں کو چھوڑ دیں تو باقی غزل گوئی محض قوافی اور ردیف کی ایک بے روح زنجیر بن کر نہیں رہ جاتی؟ تو اس خامی سے یہ مطلب ہر گز اخذ نہیں کیا جا سکتا کہ صنفِ غزل کے وجود ہی میں کوئی کھوٹ یا عیب ہے؛ بالکل اسی طرح، ترجمے کا فن بھی ایک ایسا فن ہے جس کے حقیقی ماہرین انگشت شمار ہوتے ہیں، لیکن دعویٰ سبھی ترجمہ نگاری کا کرتے ہیں۔ لہٰذا یہ اعتراض کرنا کہ ترجمہ کرنے سے کوئی معنوی فائدہ حاصل نہیں ہوتا، نہایت ہی بودا، کمزور اور غیر علمی خیال ہے۔ مغربی فکری روایات کے نامور نظریہ دان **جارج سٹینر (George Steiner)** اس جمالیاتی توازن پر بحث کرتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار اِس صورت میں **بیان کرتے ہیں** کہ:

**"ایک معیاری ترجمے کا معیار مآخذ متن کے فکری جوہر کے ساتھ وفاداری اور ہدف زبان کے اسلوب کی ندرت وخوبصورتی کے مابین توازن پر قائم ہوتا ہے"**[11]۔

ترجمہ نگاری اگر ایک عظیم اور وسیع فن ہے، تو یہ فکری خیال بھی پیشِ نظر رکھنا چاہیے کہ ترجمے کو پڑھنے والے قارئین بھی اسے محض وقت گزاری کے لیے نہیں پڑھتے، بلکہ وہ اس ذریعے سے دوسرے معاشروں، دور افتادہ ممالک اور اجنبی ثقافتوں کے بارے میں سچی معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ایسے میں اگر ترجمے کے دوران کچھ معمولی اور لغوی خامیاں رہ بھی جائیں، تو قاری ان خامیوں کو نظر انداز کر کے متن میں رہ گئی چیزوں کے بارے میں اپنے ذوق کے مطابق خود بخود معلومات حاصل کر لیتا ہے۔ قرآن مجید اس دعوے کی بہترین اور سب سے معتبر مثال ہے، جس کے تراجم کو پڑھ کر ہی پوری دنیا کے غیر عربی داں حضرات قرآن کے الٰہیاتی مفہوم کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اور بہت حد تک قرآنی احکام اور اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا بھی ہیں؛ حالانکہ عربی زبان میں نازل کیا گیا قرآن چودہ سو سال قبل کی زبان میں ہے۔ اور آج اگرچہ عربی دنیا کی چند بڑی زبانوں میں شامل ہے، لیکن خود عرب دنیا میں بھی چودہ صدی پہلے کی وہ قرآنی زبان اب ایک کلاسیکی زبان کا درجہ حاصل کر چکی ہے۔ لیکن اس کا یہ قطعی مطلب نہیں ہے کہ قرآن کے مفاہیم کو سمجھنے میں عام انسانوں کو کہیں کوئی مستقل دقت پیش آتی ہے۔ جنہیں فکری دقت پیش آتی بھی ہے وہ علمی سستی کے باعث ہی آتی ہے، ورنہ راسخون فی العلم اور ماہرین کے لیے یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے؛ اور اسی لیے اسلامی اسکالروں کی ایک کثیر تعداد نے نہ صرف یہ کہ قرآن مجید کے متعدد زبانوں میں تراجم کیے ہیں بلکہ تفسیری لٹریچر بھی قلمبند کیا ہے اور "استعارات القرآن" جیسی معتبر کتابیں تک تصنیف کی جا چکی ہیں۔

ترجمے کے ان لسانی اور سماجی تعصبات پر تفصیلی بحث کرتے ہوئے ممتاز محقق **پروفیسر ظہور الدین** زبان اور تمدن کے اس باہمی گٹھ جوڑ کو واضح کرنے کے لیے یوں **وضاحت کرتے ہیں** کہ:

**"ترجمہ ایک ایسا جوہر ہے جو بے محنت پیہم قطعاً نہیں کھلتا۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ ترجمہ کا تعلق دو زبانوں سے ہوتا ہے۔ یعنی کسی ایک زبان میں موجود تحریر کو دوسری زبان کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کی جاتی ہے لیکن ہمیں یہ بھی بخوبی معلوم ہے کہ زبانیں محض الفاظ کا انبوہ نہیں ہوتیں۔ وہ اپنے وجود میں ایک مخصوص لسانی کینڈے، مخصوص لب ولہجے، اور زندگی کے مخصوص آداب واطوار کا نظام لیے ہوتی ہیں۔ زبانیں بولنے والوں کے تہذیب وتمدن اور احساسات وجذبات کے اظہار کے مخصوص اسالیب لئے ہوئے ہوتی ہیں۔ چنانچہ ترجمہ کار ترجمہ کرتے وقت ان سبھی کو ملحوظ رکھتے ہوئے مفہوم کی ترسیل کے تقاضے پورے کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ زبانوں کو ان کے لسانی وتمدنی انسلاکات سے الگ کرنے کا مطلب ان کی بحرمتی کرنا اور افہام وتفہیم کی راہیں مسدود کرنا ہے"**[12]۔

ماہرینِ لسانیات نے تراجم کے اس نازک سلسلے میں مختلف رائیں دی ہیں۔ ممتاز عالم **پروفیسر ظہیر احمد صدیقی** اردو تراجم کی تاریخی حیثیت اور اس کے تہذیبی کردار کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے اِس حوالے سے یوں **بیان کرتے ہیں** کہ:

ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT



**"اردو تراجم اردو زبان کی گذشتہ ترقی اور آئندہ امکانات کے آئینہ دار ہیں وہ اردو بولنے والی سوسائٹی کی ذہنی نشو نما کا پیمانہ ہیں۔ اگرچہ اردو تراجم ان ترجموں کے مقابلے جو انگریزی یا عربی میں کئے گئے ہیں کم ہیں۔ لیکن اردو زبان اور اس کی عمر کو دیکھتے ہوئے ان کی اہمیت نا قابل انکار ہے۔ ایک ملک یا ایک کلچر کے خیالات کو دوسرے ملک اور دوسرے کلچر کی زبان میں منتقل کرنے کو ترجمہ کہتے ہیں۔ فارسی اور انگریزی بولنے والی قوم نے جب فکر و جذبات کے دیسی طریقوں سے اپنے آپ کو قریب کرنا چاہا تو ترجموں سے مدد لی۔ ترجمہ اپنے محدود معانی میں ایک آرٹ ہے۔ اور وسیع معنوں میں ایک طرز زندگی ہے۔ اردو میں ترجمہ وسیع مفہوم کے اعتبار سے زیادہ نمایاں ہے۔ اس کا ثبوت اردو شاعری میں خاص طور سے ملے گا۔ اگرچہ اردو شاعری میں شاہنامہ جیسا شاہکار نہ ہوسکا۔ مگر ایرانی اسپرٹ اور کلچر کو اپنی شاعری میں سمو کر ترجمہ کا وہ پہلو پیش کیا جس کو طرز زندگی سے تعبیر کرسکتے ہیں۔ اس لئے اردو ہندوستانی اور دوسری تہذیبوں کی روایت کے درمیان ایک پل بن گئی اور یہی ترجمہ کا آرٹ بھی ہے اور مقصد بھی"[13]۔**

موصوف اچھے تراجم کی ندرت اور اس فن کی عمیق پیچیدگی کی مزید تشریح کرتے ہوئے اپنے گراں قدر مقالے میں یہ فکری نقطہ **بیان کرتے ہیں کہ:**

**"ترجمہ بڑا مشکل کام ہے یہ نگینہ جڑنے کا فن ہے۔ جو بڑی مہارت اور ریاضت چاہتا ہے۔ ایک زبان کے معانی و مطالب کو دوسری زبان میں اس طرح منتقل کرنے کے لئے کہ اصل عبارت کی خوبی اور مطلب جوں کا توں باقی رہے۔ دونوں زبانوں پر یکساں قدرت کی ضرورت ہوتی ہے جو عام طور پر کمیاب ہوتی ہے۔ ترجمے بہت ملتے ہیں لیکن اچھے ترجمے خال خال ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر وہ شخص جو زبانیں جانتا ہے بزعم خود مترجم بن بیٹھتا ہے اور ایسے ایسے گل بوٹے کھلاتا ہے کہ ترجمے کی اہمیت وافادیت مجروح ہو جاتی ہے اور ترجموں پر سے اعتبار اٹھ جاتا ہے"[14] ۔**

ماہرین کی ان قیمتی آراء اور فکری نظریات کو پیشِ نظر رکھیں تو یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہوتی ہے کہ ترجمہ نگاری ایک انتہائی مشکل، پیچیدہ اور ریاضت طلب فن ہے۔ اور اس نازک فریضے کو بخوبی انجام دینے کے لیے نہ صرف ماخذ اور ہدف زبان پر کامل عبور حاصل ہونا پہلی شرط ہے، بلکہ دونوں زبانوں کے تاریخی ارتقاء، ان زبانوں کے جغرافیائی احوال، سیاسی و سماجی عوامل، زبانوں کے بطن میں رونما ہونے والی ادبی تحریکات، اور علاقائی بولیوں کے ان زبانوں پر اثرات وغیرہ کو گہرائی میں سمجھنا نہایت ہی ضروری ہے، تب جا کر ترجمہ نگاری کا حقیقی حق ادا ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر، عربی زبان وادب کے معاصر عہد کے کسی افسانے یا نظم کا ترجمہ اگر ہم اردو میں کرنے بیٹھیں گے، تو عربی زبان پر کامل دسترس کے سزاوار ہم اسی وقت ہو سکتے ہیں جب ہم جدید عربی زبان کے اسالیب کے ساتھ ساتھ کلاسیکی عربی شاعری کی روایات سے بھی کماحقہ واقف ہوں، اور اس کے ساتھ ہی خطۂ عرب میں رونما ہونے والے سیاسی و انقلابی حالات سے واقفیت بھی بنیادی شرط ہے۔ مان لیا جائے کہ کوئی ایسا ادبی فن پارہ ہمارے سامنے موجود ہے جس میں مصنف نے فلسطین کے المیہ اور وہاں کے سیاسی احوال کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ ایسے میں ہم جب تک فلسطین کے سیاسی و تاریخی حالات کو کماحقہ نہیں جانیں گے، اس شہ پارے کے ترجمے کا حق کبھی ادا نہیں کر سکتے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ ہمیں ہدف زبان یعنی اردو پر اس طرح تخلیقی دسترس ہونی چاہیے کہ ہم یہ بھی طے کر سکیں کہ اردو میں انقلابی اور مزاحمتی شاعری کا حقیقی اسلوب کیا رہا ہے، اور کن اسالیب کو اپنانے والے شاعروں نے عوام و خواص میں مقبولیت حاصل کی ہے۔ عربی کے مشہور انقلابی شاعروں کی فہرست کے ساتھ اردو کے ان مشہور انقلابی شاعروں کا جب ہم تنقیدی موازنہ کریں گے، تو خود بخود ہمارے سامنے موجود ماخذ متن کی حقیقی ادبی حیثیت اور معنوی وزن واضح ہو جائے گا۔ اور اس کے ترجمے کے لیے ایک ایسا نیا اسلوب، جس میں دونوں زبانوں کی مشترکہ اسلوبیاتی اور بلاغتی خوبیاں موجود ہوں، ہمارے لیے منتخب کرنے میں آسانی ہو جائے گی اور اب جو ترجمہ وجود میں آئے گا، وہ دونوں زبانوں کے محاسن سے ممیز ہو گا اور ایک معقول و مستند ترجمہ کہلائے گا۔

یوں تو ترجمے کے لیے اردو زبان میں کوئی باضابطہ اور جامد اصول مرتب نہیں ہو پایا ہے، لیکن سنجیدہ اسکولروں نے اپنے طور پر کچھ گرانقدر اصول وضوابط وضع کیے ہیں۔ اگر ترجمہ نگار ان اصولوں کی روشنی میں کام کرے، تو یقیناً ترجمہ نگاری جیسے فن کی قدر وقیمت اور علمی وقار میں خاطر خواہ اضافہ ہو گا۔ حالانکہ ترجمہ نگاری کا فن بھی دیگر فنونِ لطیفہ کی طرح مترجم کے ساتھ ایک عمیق ذہنی ہم آہنگی اور فکری جرٔت کا تقاضا کرتا ہے، اور جب تک اس فن سے ترجمہ نگار کو ایک روحانی شغف اور باطنی لگاؤ نہیں ہو گا، اس وقت تک اس کا حق ادا ہونا ممکن نہیں ہے۔ لیکن اگر اس ذوق اور شوق کے ساتھ ساتھ کچھ علمی اصولوں کی پابندی بھی اختیار کرلی جائے، تو یقیناً ترجمہ نگاری کے مراحل میں آسانی پیدا ہو جائے گی۔ پروفیسر ظہور الدین صاحب نے اس سلسلے میں کافی غور وخوض اور طویل علمی کاوش کے بعد جو اصول مقرر کیے ہیں، ہمارے لیے ان میں کسی بھی قسم کی ترمیم یا کٹوتی کی گنجائش موجود نہیں ہے، کیونکہ انہوں نے ترجمہ نگاری کے تمام آداب وضروریات کو سامنے رکھ کر، اور مشرق کے علاوہ مغرب کے اساتذۂ ترجمہ نگاری کے اصولوں اور

ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT



نظریات کا گہرا مطالعہ کر کے یہ چھ اصول مرتب کیے ہیں جن میں پہلا مفہوم کی ترسیل، دوسرا ہیئت، تیسرا مصنف کی منشا کا احترام، چوتھا بنیادی زبان کا اثر، پانچواں اسلوب اور شفافیت، اور چھٹا محاورہ ہے۔

مفہوم کی ترسیل سے مراد صرف یہ نہیں ہے کہ ترجمہ نگار سورس لنگویج کے تمام لغوی الفاظ کو ٹارگیٹ لنگویج میں من وعن تبدیل شدہ زبان میں منتقل کر دے، بلکہ مترجم کا یہ فرضِ عین ہے کہ وہ سورس لنگویج میں جو استعمال شدہ عبارت یا اسلوب ہے، اس کی باطنی تہہ تک پہنچے۔ اور اس شہہ پارے میں موجود معنی کی اس زیریں پرت (Subtext) تک رسائی حاصل کرے جو کسی بھی عظیم شاہکار کی اندرونی سطح پر موجود رہتی ہے؛ یعنی مفہوم کی پوری طرح ترسیل ہو جائے اور اگر کہیں متن میں کسی صنعت، بالخصوص صنعتِ تلمیح کا استعمال کیا گیا ہو، تو اس تاریخی، اساطیری یا مذہبی واقعے کو فٹ نوٹ میں ضرور واضح کر دیا جائے تا کہ قاری پوری طرح مفہوم سے آگاہ ہو سکے۔ مثال کے طور پر، اگر ہم حکیم الامت علامہ اقبال کے اس شاہکار شعر کا انگریزی، ہندی یا کسی دوسری غیر زبان میں ترجمہ کر رہے ہوں کہ کشتی مسکین وجان پاک ودیوار یتیم، علم موسی بھی ہے تیرے سامنے حیرت فروش؛ تو یہاں ترجمے کے ساتھ قرآن مجید کا حوالہ اور سورۂ کہف کا پس منظر بیان کرنا نہایت ضروری ہے تا کہ حضرت خضر اور حضرت موسیٰ علیہما السلام کے مابین ہونے والے اس غیبی واقعے تک قاری کی ذہنی رسائی ممکن ہو سکے، ورنہ ترجمہ ادھورا رہ جائے گا۔ جہاں تک سوال ہیئت (Form) کا ہے، تو کچھ تراجم تو ایسے ہی ہونے چاہئیے جیسے کہ وہ اصل متن (Original Text) میں موجود ہیں۔ خاص طور پر دفتری کاغذات، قانونی دستاویزات اور سرکاری متون؛ ان میں کسی بھی قسم کی تحریف یا تخلیقی آزادی ترجمہ نگاری کے بنیادی اصولوں کے سخت خلاف ہو گی۔ لیکن پھر بھی زبان کے باطنی مزاج اور نحوی مجبوری کی بنا پر اگر جملوں کی ساخت میں کوئی متبادل لفظی تبدیلی ہو جائے جو ناگزیر ہو، تو اسے قابلِ اعتراض نہیں گردانا جانا چاہیے۔ لیکن ایسے الفاظ یا جملے جن کے ترجمے پر مترجم کو شک ہو، انہیں خط کشید (Underline) کر دینا چاہیے تا کہ قاری یا محقق اس کی جانچ کر سکے۔

منشائے مصنف کا احترام بھی ترجمے کے فن میں ایک بنیادی اور اساسی رکن کی حیثیت رکھتا ہے؛ منشائے مصنف اپنے آپ میں ایک بہت بڑا معنوی اور فکری سیاق رکھتا ہے۔ جدید تنقیدی تھیوری (Modern Critical Theory) اور مسبوقہ لسانیاتی نظریات کے مطابق، اب کسی بھی فن پارے کا صرف مصنف ہی اہم نہیں رہا، اور نہ ہی وہ فن پارہ اپنی ذات میں مکمل ہے، بلکہ قاری کے پڑھنے اور قرأت کا وہ طریقہ ہے جس کے تحت وہ اس فن پارے کا مطالعہ کر رہا ہے جسے ہم "موتِ مصنف (Death of the Author) " کے نظریے سے بھی تعبیر کرتے ہیں۔ یعنی منشائے مصنف کچھ بھی ہو، جس عہد میں قاری اسے جس ذہنی صلاحیت، نفسیاتی میلان اور جس انداز سے پڑھ رہا ہے اور اس سے جو معنی اخذ کر رہا ہے، وہی معنی اصل اور حقیقی مانے جائیں گے؛ یعنی زبان کے اصول وضوابط، رموز وعلامات اور روایات کی وہ کیا کارکردگی ہے جس سے ایک ہیئتی پیکر بنتا ہے، اور لفظوں، ترکیبوں اور جملوں کی ترتیب اور تواتر سے پڑھنے کے عمل کے دوران قاری پر کیا معنی منکشف ہوتے ہیں یا کیا ادبی مفہوم برآمد ہوتا ہے۔ لیکن ان تمام جدید تنقیدی نظریات کے باوجود، منشائے مصنف کا بنیادی ادراک تو مترجم کو ہونا ہی چاہیے، تا کہ وہ وقتی طور پر جب ترجمہ کرنے بیٹھے تو اسے اس بات کا پورا خیال رہے کہ اس متن میں مصنف کا لہجہ پر تکلف ہے، بے تکلف ہے یا سرد ہے، پر جوش ہے یا پھر وہ کسی ذاتی نوعیت کے منفرد اسلوب کا استعمال کر رہا ہے۔ مصنف کی حقیقی منشا کو جانے بغیر — کہ مصنف اس متن کے ذریعے معاشرے کو کوئی پیغام دینا چاہتا ہے، کسی قومی المیے یا سانحے پر نوحہ کناں ہونا چاہتا ہے، کسی اہم تاریخی موقع پر مسرت کا اظہار کرنا چاہتا ہے، سوتے ہوئے لوگوں کو غفلت کی نیند سے جگانا چاہتا ہے یا پھر بے جا اشتعال اور جذباتیت سے باز رکھ کر قوم کے لوگوں کو صبر واستقامت کی تلقین کرنا چاہتا ہے — ترجمہ شروع کرنا علمی دیانت کے خلاف ہے۔ یعنی ترجمہ نگار کو چاہیے کہ وہ مصنف کی بنیادی منشا کو گہرائی میں سمجھ کر ہی ترجمے کا آغاز کرے تا کہ ترجمے کی تکمیل کے بعد متن میں کوئی ابہام یا معنوی الجھن باقی نہ رہے۔

بنیادی اور مآخذ زبان کا ترجمے کے اسلوب پر اثر انداز ہونا ایک لازمی اور فطری امر ہے۔ لیکن اسی لسانی اثر سے ایک قابل اور زیرک مترجم ہی یوں چھٹکارا پا سکتا ہے کہ وہ سورس لنگویج کو پوری طرح سمجھ لے، منشائے مصنف کے باطن تک پہنچ جائے، مخصوص فکری نکات اور محاورات تک اس کی رسائی ہو جائے، اور متن میں استعمال ہونے والی مختلف ادبی صنعتوں سے پوری طرح واقف ہو جائے۔ پھر وہ اصل متن کو ایک طرف رکھ کر، اس پورے فن پارے کو ٹارگیٹ لنگویج (ہدف زبان) کے بنیادی قواعد اور نحوی اصولوں کی روشنی میں نئے سرے سے دوبارہ لکھ ڈالے؛ اور اسی مصلحت کے تحت مترجم کا خود ایک مصنف ہونا بھی ضروری ہے تا کہ وہ ترجمے کے دوران صنعتی اور اسلوبیاتی تقاضوں کا پورا خیال رکھ سکے۔ اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ مترجم کو متن کے بنیادی اسلوب کو بدلنا نہیں چاہیے، لیکن ادبی فن پاروں کا ترجمہ کرتے وقت اگر مترجم یہ شدت سے محسوس

ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT



کرے کہ بنیادی متن کا پلاٹ (Plot) ڈھیلا ہے، اس میں غیر ضروری تکرار موجود ہے، یا وہ ایک بے ڈول ساختیاتی پلاٹ ہے، تو یہاں وہ ایک اچھے مصنف کی طرح منشائے مصنف کو نظر میں رکھتے ہوئے فن پارے کی ان فنی اور اسلوبیاتی خامیوں کو دور کر سکتا ہے اور اسے ایک متوازن شکل دے سکتا ہے۔

ترجمے کے عمل کے دوران ایک نہایت اہم اور کٹھن مرحلہ اس وقت سامنے آتا ہے جب مترجم کا سابقہ سورس لنگویج (ماٰخذ زبان) کے محاورات سے پڑتا ہے۔ اس ضمن میں تشبیہیں، استعارے، ضرب الامثال، اقوال، علاقائی بولیاں اور روزمرہ کے عامیانہ الفاظ بھی سامنے آتے ہیں، جنہیں ہدف زبان کے قالب میں ڈھالنا اور ترجمہ کرنا انتہائی مشکل امر ہوتا ہے۔ لیکن اس ابلاغی مشکل کے حل کے لیے نہایت زیرک اور ماہر مترجمین دو طرح کے مناہج اختیار کرتے ہیں؛ اول تو وہ ایسے غیر ضروری حصوں کو ہی متن سے حذف کر دیتے ہیں جنہیں ترجمہ کرنا ناگزیر نہیں ہوتا اور جن کے نکال دینے سے کلی طور پر فن پارے کی فکری عمارت پر کوئی منفی اثر نہیں پڑتا۔ دوم یہ کہ وہ ہدف زبان میں موجود قریبی مترادفات کا سہارا لیتے ہیں اور اصل لفظ کا لفظی ترجمہ برائے معلومات قوسین (Parentheses) میں لکھ دیتے ہیں۔ کچھ محاورے ایسے بھی ہوتے ہیں جو ٹارگیٹ لنگویج میں منتقل ہونے کے بعد قاری تک کوئی معنی یا مفہوم کی ترسیل نہیں کر سکتے، چنانچہ انہیں بھی متن سے خارج کر دیا جاتا ہے۔ یعنی کل ملا کر ان تمام لسانی اور تہذیبی مراحل سے گزرنے کے لیے بھی تنقید میں کوئی خاص یا جامد اصول مقرر نہیں کیے جا سکے ہیں۔ یہ تمام تر صوابدید مترجم کی ذات اور اس کی علمی صلاحیت پر منحصر ہے کہ وہ کس مرحلے سے کس طرح عہدہ برآ ہوتا ہے اور معنوی بحران سے متن کو کیسے نکالتا ہے۔ ترجمہ نگار کے سامنے ترجمہ کرتے وقت یہ بات واضح طور پر موجود ہونی چاہیے کہ وہ ترجمے کا حقیقی مقصد حاصل کر رہا ہے یا نہیں۔ اب ترجمے کے مقاصد پر تفصیلی گفتگو کرنے کے لیے بھی ماہرین نے قیمتی خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ممتاز نظریہ دان **پروفیسر محمد حسن** ترجمے کے ان اغراض و مقاصد کی تفریق کرتے ہوئے اپنے مضمون میں علمی ذوق کے مطابق یوں **رقمطراز ہیں** کہ:

**"بنیادی طور پر کسی ترجمے کے تین مقاصد ممکن ہیں: پہلا معلوماتی، دوسرا تہذیبی اور تیسرا جمالیاتی"**[15]۔

پروفیسر محمد حسن صاحب کی یہ تنقیدی رائے کسی حد تک مروجہ نظریات میں سب سے مستند مانی گئی ہے، کیونکہ تراجم کے سلسلے میں جو اصول مرتب ہیں، ان تمام کو سامنے رکھ کر موصوف نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے اور ترجمے کا اصل مقصد بھی اس سے پورا ہو جاتا ہے۔ عام طور پر ترجمے کا وہی اسلوب زیادہ پسندیدہ اور معتبر مانا جاتا ہے جو سورس لنگویج (ماٰخذ زبان) کے علمی ڈھانچے سے زیادہ قریب ہو۔ لیکن اس ضمن میں صرف دستاویزی تراجم اور معلومات سے متعلق سائنسی تراجم ہی آ سکتے ہیں، لیکن اس میں بھی یہ قباحت ہمیشہ موجود ہوتی ہے کہ کیا اصطلاحاتِ علمیہ کا من و عن اور جوں کا توں ترجمہ ممکن ہے؟ لیکن مترجم کا بنیادی فرض ہے کہ وہ معلوماتی اور سائنسی ترجمے میں متن کے الفاظ کے زیادہ سے زیادہ قریب رہے۔ دستاویزی اور قانونی ترجمے میں تو انحرافِ لفظی کے خطرناک اور بھیانک نتائج بھی رونما ہو سکتے ہیں، کیونکہ ایک واحد لفظ کے غلط ترجمے سے پورے متن کے قانونی مفہوم میں تبدیلی آ سکتی ہے اور منشائے متن کا رخ بدل سکتا ہے۔ لیکن معلوماتی ترجمے میں سب سے مشکل اور کٹھن مرحلہ اس وقت سامنے آتا ہے جب کسی گہرے فلسفیانہ متن (Philosophical Text) کا ترجمہ کیا جاتا ہے۔ یہاں معلومات بہم پہنچانے کے لیے مادی اشیاء کے ناموں کا نہیں، بلکہ مجرد تصورات (Concepts) کا ترجمہ کرنا ہوتا ہے اور تصورات کے اتنے ابعاد اور معنوی تہیں ہوتی ہیں کہ یہاں زبان کا ساتھ دینا مشکل ہو جاتا ہے۔ اسی لیے فلسفیانہ کتابوں کے مترجمین کو قدم قدم پر شدید علمی دقتوں اور لسانی رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، لیکن مترجم کے سامنے بہر حال یہ بنیادی مقصد رہتا ہے کہ اپنے قاری تک اصل متن کے بنیادی مفاہیم کی ترسیل ہو جائے اور جو مترجم اس معنوی ترسیل میں کامیاب رہتے ہیں، ان کے ترجمے کا مقصد بھی پورا ہو جاتا ہے۔ یہاں یہ علمی خیال رہے کہ ترجمے کے بعد اگر ہدف زبان کی ساری تحریریں غیر معمولی طور پر رواں، شستہ اور عام فہم ہوں، تو محقق کو یہ شبہ رکھنا چاہیے کہ یہاں منشائے مصنف سے کہیں نہ کہیں انحراف کیا گیا ہوگا اور متن کو آسان بنانے کے لیے اس کا معنوی وزن کم کر دیا گیا ہوگا۔ خاص طور پر فلسفیانہ متون کے ترجمے میں روانی اور شستگی کو برقرار رکھنے کے ساتھ ساتھ منشائے مصنف کا احترام کرنا بہت مشکل، بلکہ ناممکنات میں سے ہے۔ اس لحاظ سے اکابرین اور نظریہ دانوں کی یہ رائے بالکل صائب ہے کہ روانی اور شستگی ہمیشہ اور ہر ترجمے کے اعلیٰ اور معیاری ہونے کا واحد پیمانہ نہیں ہو سکتی۔

پروفیسر محمد حسن نے ترجمے کا جو دوسرا مقصد بیان کیا ہے، وہ ہے تہذیبی سطح۔ تہذیب اپنے آپ میں ایک بہت وسیع، گہری اور وقیع اصطلاح ہے؛ اس دوررس موضوع پر مفصل گفتگو کرتے ہوئے ملک کے مایہ ناز اور آفاقی شاعر **فیض احمد فیض** تمدن اور ثقافت کی گہرائی کو یوں **بیان کرتے ہیں** کہ:

**"کرہ ارض پر بسنے والے انسانی گروہوں نے اپنی مادی اور روحانی ضروریات کو تسکین دینے اور ایک منظم اور مربوط معاشرتی زندگی بسر کرنے کے لئے کچھ نصب العین وضع کیے۔ رہن سہن کے کچھ طریقے ایجاد کئے کچھ عقائد اختیار کئے کچھ رسمیں بنائیں کچھ قوانین وضع کئے حلال اور حرام کے درمیان کچھ امتیازات قائم کئے، کچھ نظریات و تصورات**

**وعلوم وفنون سے دلچسپی لی۔ اس طرح سماجی تعلقات کے تعاون سے) جو خود بھی اس طرح وجود میں آئے تھے) ان اکتسابات نے ذیلی اختلافات کی گنگا کے باوجود افراد معاشرہ میں تنظیم اور یکسانی کردار پیدا کیے۔ اور ان کی افادیت مسلم ٹھہری۔ چنانچہ اگلی نسل تک انہیں مستقل کرنا ضروری ہوا۔ نسلاً بعد نسلٍ مستقل ہونے والے اکتسابات کے اس مجموعہ کو تہذیب وثقافت کہتے ہیں ثقافت کوئی وہبی یا جبلی چیز نہیں بلکہ وہ معاشرے کا نظام، کردار (طرز عمل وطرز فکر) ہے جسے ہم کسی معاشرے میں رہتے ہوئے اکتساب کرتے ہیں۔ اگرچہ اس خاص معاشرے میں تربیت پانے کے باعث بسااوقات ہمیں احساس تک نہیں ہوتا کہ ہم نے ثقافت وتہذیب کا باضابطہ اکتساب کیا ہے"[16] ۔**

یہاں گہرائی میں غور کرنے کی ضرورت ہے کہ جب تہذیب اس قدر عمیق، وسیع اور تہہ در تہہ معانی سے لبریز ہے، تو ایسی صورت میں تہذیبی ترجمے کا حلقہ کس قدر بسیط اور کثیر الجہت ہو گا؛ یہاں مترجم محض الفاظ کا تبادلہ نہیں کرتا بلکہ ایک پوری تہذیب کے تصورات، اساطیر اور عقائد کو دوسری تہذیب کے تصوراتی اور لسانی پیکر میں منتقل کرتا ہے۔ صرف ایک لفظ کے متبادل دوسرا لغوی لفظ لانا تو آسان کام ہے، لیکن جب پوری تہذیبی کینڈے اور ثقافتی فریم کو دوسری تہذیبی معنویت میں داخل کرنا ہوتا ہے، تو یہ ایک نہایت مشکل، صبر طلب اور دیر طلب کام بن جاتا ہے۔ ایک مخصوص تہذیبی سیاق سے پیدا شدہ لفظ اپنے اندر اس معاشرے کی پوری تاریخ کو پیوست رکھتا ہے، وہ لفظ دراصل اپنے تہذیبی فکر کا نگار خانہ ہوتا ہے؛ ایسے میں مترجم کو ہدف زبان کے کسی ایسے ہی متبادل تہذیبی لفظ میں اسے منتقل کرنا ہو گا، تب ہی ترجمے کا حقیقی حق ادا ہو سکے گا۔ بطور خاص ناول اور افسانے جیسے فکشن کے ترجمے میں یہ کٹھن مراحل اس وقت سامنے آتا ہے جب ہم ناول کی کہانی کے ساتھ ساتھ اس معاشرے کے پورے کلچر اور تہذیب کو بھی ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ ترجمے کا یہ نہایت ہی اہم اور نازک مرحلہ ہوتا ہے اور جس کمالِ مرتبت مترجم نے اس تہذیبی حق کو ادا کر دیا، تو یہ سمجھیے کہ اس نے فنِ ترجمہ نگاری کا حق ادا کر دیا۔

پروفیسر محمد حسن نے ترجمے کی جس تیسری سطح کا ذکر کیا ہے، وہ جمالیاتی سطح ہے، جو ان کی نظر میں بھی سب سے زیادہ دشوار اور کٹھن ہے۔ **پروفیسر محمد حسن** اس شعری اور فنی نزاکت کی تفصیلات پر **روشنی ڈالتے ہیں** کہ:

**"تیسری سطح جمالیاتی ہے۔ اور غالباً سب سے زیادہ دشوار ہے۔ جمالیاتی انبساط خود نہایت ہی پیچیدہ عمل ہے۔ دوسرے یہ عمل الفاظ کے سطحی معنوں کے بجائے ان کی متنوع متعلقات کے ذریعہ ادا ہوتا ہے الفاظ صرف معلومات یا محض تصورات پیش نہیں کرتے بلکہ ایک خاص فضا اور کیفیت چھوڑتے گزر جاتے ہیں۔ سنسکرت کے ماہرین نے شعریات کے معنی کی سات نوعیتیں قرار دی ہیں جن میں معلومات کی ترسیل طنز، تضاد، محاورہ ,علامتی اظہار، کیفیت سبھی شامل ہیں۔ ایک زبان کے ایسے ہمہ جہت لفظ کو دوسری زبان اور دوسری تہذیب کے سیاق وسباق میں بٹھانا مشکل ہوتا ہے۔ اسی لئے شاعری کا ترجمہ سب سے زیادہ دشوار ہے"[17]۔**

جمالیات اپنے وجود میں بذاتِ خود ایک نہایت وقیع اور فلسفیانہ اصطلاح ہے۔ دنیا کے بڑے مفکرین نے جمالیات کی تعریف مختلف انداز سے کی ہے، لیکن کل ملا کر جمالیات کی اس تعریفی اساس پر سب کا اجماع اور اتفاق ہے کہ جمالیات بنیادی طور پر حسن اور فن کاری کا فلسفہ ہے۔ جمالیات سے مراد اربابِ فلسفہ کے وہ نظریات اور فکری اصول ہیں جو حسن اور اس کے کوائف، مظاہر اور باریکیوں (جن میں فنونِ لطیفہ بھی شامل ہیں) کی علمی تحقیق و تشریح میں پیش کیے گئے ہیں۔ اردو زبان میں انگریزی اصطلاح "Aesthetics" کا ترجمہ جمالیات کیا جاتا ہے۔ فلسفۂ حسن وفن کے لیے اس یونانی لفظ کو مروجہ اصطلاحی معنوں میں سب سے پہلے جرمن فلسفی، بام گارٹن نے استعمال کیا تھا۔ یونانی زبان کے لغوی مأخذ کے مطابق اس لفظ کے لغوی معنی ایسی شے کے ہیں جو حواسِ خمسہ کے ذریعے محسوس کی جا سکے یعنی صدرک بالحواس ہو۔ جمالیات یوں تو فلسفے کا ہی ایک ذیلی شعبہ ہے، لیکن اس نے حکمائے جمالیات کی مسلسل ذہنی کاوشوں کی بدولت معاصر عہد میں اپنی ایک الگ، منفرد اور مستقل علمی حیثیت اختیار کر لی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ پروفیسر محمد حسن نے جمالیاتی سطح کے تراجم کو دنیا میں سب سے زیادہ مشکل، پیچیدہ اور مخدوش قرار دیا ہے۔ اس قسم کے تراجم میں سورس لنگویج (مآخذ زبان) میں جو الفاظ استعمال کیے گئے ہوتے ہیں، ان کے پسِ پشت ایک گہری فلسفیانہ اور اساطیری اساس ہوتی ہے، اور وہ الفاظ ہمیشہ صرف ایک ہلکا سا اشارہ کرتے ہیں اور سطحی جملوں کے پسِ پشت وہ عمیق خیالات اور افکار جھانکتے رہتے ہیں جو اصل میں منشائے مصنف ہیں۔ طنز، تضاد، محاورہ، علامتی اظہار، کنایہ، اور باطنی کیفیت ——یہ سب ایسی مجرد چیزیں نہیں ہیں جنہیں کوئی بھی مترجم محض لفظوں کی ظاہری تبدیلی کے ساتھ ہدف زبان میں پیش کر سکے۔ افکار وخیالات کے ایک لامتناہی اور گہرے سلسلے کو لفظوں کی لغوی تبدیلی کے ساتھ پیش کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے، اور جو مترجمین اس مشکل اور کٹھن مرحلے سے اپنے ترجمے کو با آسانی پار لے جاتے ہیں، وہ یقیناً علمی دنیا میں تحسین اور خراجِ تحسین کے حقدار ہیں۔

ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT



پروفیسر عنوان چشتی نے ادبی اور شعری تراجم کے اسی نازک سلسلے میں نہایت بلیغ اور قیمتی بات کہی ہے، چنانچہ **پروفیسر عنوان چشتی** شعری ابلاغ کی اس معنوی کثرت اور امکانات پر بحث کرتے ہوئے یوں **وضاحت کرتے ہیں** کہ:

**"ابلاغ کا نقطہ عروج وہ منزل ہے جہاں قاری کے ذہن پر ایک سے زیادہ معنی کا انکشاف ہوتا ہے اور اس کو ایک شعر میں بہت سے جوالہ ہائے معانی نظر آتے ہیں مثلاً غالب کے بہت سے شعر معانی کے اعتبار سے ایک سے زیادہ امکانات کے حامل ہیں۔ یہ امکانات کبھی ایک ہی مفہوم کے مختلف پہلو ہوتے ہیں اور کبھی ایک دوسرے سے متضاد ہوتے ہیں۔ معانی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرنا مترجم کا نہیں بلکہ تشریح نگار کا کام ہے۔ ایسے موقعوں پر مترجم ہجوم معانی سے ایک کا انتخاب کر کے دوسرے معانی کو چھوڑ دیتا ہے۔ انتخاب واحتساب کا یہ عمل ایک شعوری عمل اور مصنف کے فلسفہ زندگی انداز نگارش موضوع کی مناسبت اور عبارت کے سیاق وسباق کی روشنی میں کیا جاتا ہے۔"[18]۔**

پروفیسر عنوان چشتی کے اس فکری خیال کے مطابق، جمالیاتی اور شعری ترجمے کے وقت مترجم کو یہ مکمل آزادی حاصل ہوتی ہے کہ وہ مآخذ متن سے اپنے علمی ذوق کے مطابق اخذِ معنی کرے، اور علامات و استعارات کے مخفی مفہوم کو واضح کرنے کے لیے اپنے طور پر ٹارگیٹ لنگویج (ہدف زبان) سے ایسے خوبصورت الفاظ اور اصطلاحات کا انتخاب کرے جس کے نتیجے میں متن کے اندرون میں جذب شدہ حقیقی مفہوم تک قاری کی رسائی ممکن ہو سکے۔ اب یہ تمام تر عمل مترجم کی ذاتی صلاحیت اور اس کے ادبی قد وکاٹھ پر منحصر ہے کہ اس نے اصل مصنف کے افکار وخیالات کو کس حد تک اپنے باطن میں اتارا ہے، اور اس متن کی باطنی تہوں میں کس گہرائی تک رسائی حاصل کر سکا ہے۔ کیونکہ ترجمے کا اصل حق بھی یہی ہے کہ مصنف کے فکری مفہوم یعنی منشائے مصنف کو پوری طرح دوسری زبان کے الفاظ میں سمو دیا جائے۔ منشائے مصنف کے ساتھ علمی انصاف کرنے کی یہ پوری بھاری ذمہ داری مترجم کے کندھوں پر عائد ہوتی ہے، کیونکہ عام قارئین تو مترجم کے پیش کردہ ترجمے کو ہی اصل شاہکار کا متبادل سمجھتے ہیں اور اسی کے دیے گئے معنی ومفہوم کو حتمی مانتے ہیں۔ فنِ ترجمہ نگاری کے ان تمام کثیر الجہت ابعاد اور فکری زاویوں کی روشنی میں یہ دعویٰ پورے وثوق کے ساتھ کیا جا سکتا ہے کہ ترجمے کے ہی وسیلے سے ایک تہذیب، ایک زبان، اور اس زبان میں شامل تہذیبی اقدار اور روایات کا پورا نظام دوسری زبان کے لسانی حلقے میں منتقل ہوتا ہے؛ اور اسی منتقلی کے مثبت اثرات کے تحت ہی پوری دنیا کے متفرق انسانی گروہ ایک دوسرے سے متعارف بھی ہوتے ہیں اور ان کے مابین بین الثقافتی ہم آہنگی، یکجہتی اور امن قائم ہوتا ہے۔ آج کے اس جدید ترین دور میں، جہاں ساری دنیا ایک چھوٹی سی اسکرین پر سمٹ آئی ہے، ہم یہ واضح طور پر دیکھتے ہیں کہ عالمی روابط کی استواری میں سب سے بنیادی اور اساسی رول ترجمے نے ہی ادا کیا ہے؛ ورنہ ایک دوسرے کی زبانوں سے ناواقفیت کی بنا پر ہم یقیناً ابھی تک انسانی ترقی کے ان مدارج اور بلندیوں تک کبھی نہ پہنچ پاتے جہاں آج ہم خود کو کھڑا پاتے ہیں۔ نہ تو عالمی ادب وثقافت کا یہ اعلیٰ معیار قائم ہو پاتا اور نہ ہی فلسفہ، سائنس اور حکمت کی پیچیدہ گتھیاں سلجھ پاتیں۔ مختصر یہ کہ ترجمے کی روایت اتنی ہی قدیم اور ابدی ہے جتنا کہ خود اس کرۂ ارض پر انسان کا وجود ہے؛ انسان بنیادی طور پر تجسس، تدبر اور جستجو کا ایک خوبصورت آمیزہ ہے، جس کے باعث ایک دوسرے کو سمجھنے اور سمجھانے کی راہیں وہ خود ہی تلاش کر لیتا ہے، اور ترجمہ انسان کے اسی آفاقی مفاہیماتی اور ابلاغی جذبے کا ایک فطری اور تخلیقی ردِ عمل ہے۔

**حوالہ جات:**

1. قمر رئیس، پروفیسر، ترجمہ کا فن اور روایت، تاج پبلشنگ ہاؤس، مٹیا محل، جامع مسجد، دہلی، جون 1976ء، ص 19
2. محمد حسن، پروفیسر، "ترجمہ: نوعیت اور مقصد"، مشمولہ ترجمہ کا فن اور روایت، مرتبہ پروفیسر قمر رئیس، ص 69
3. محمد حسن، پروفیسر، "ترجمے کے بنیادی مسائل"، مشمولہ ترجمہ کا فن اور روایت، مرتبہ پروفیسر قمر رئیس، ص 80
4. جمیل جالبی، ڈاکٹر، تنقید اور اسلوب، مجلس ترقیِ ادب، لاہور، اشاعت سوم، 1998ء، ص 142
5. محمد حسن، پروفیسر، مشمولہ ترجمہ کا فن اور روایت، مرتبہ پروفیسر قمر رئیس، ص 179
6. گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر، ساختیات، پسِ ساختیات اور مشرقی شعریات، سنگِ میل پبلیکیشنز، لاہور، 2002ء، ص 315
7. ظہور الدین، پروفیسر، "فنِ ترجمہ نگاری"، ششماہی مجلہ تسلسل، شعبۂ اردو، جموں یونیورسٹی، جنوری تا جون 2004ء، جلد 6، شمارہ 12۔
8. فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، لسانیاتی مباحث اور اردو زبان، الوقار پبلشرز، کراچی، 2005ء، ص 88۔
9. عبد الحق نعیمی، مرزا، "فنِ ترجمہ نگاری"، ششماہی مجلہ تسلسل، شعبۂ اردو، جموں یونیورسٹی، جنوری 1999ء، جلد 1، شمارہ 2۔

10. Bassnett, Susan. Translation Studies. Routledge, London and New York, 4th Edition, 2014, p. 24.

11. Steiner, George. After Babel: Aspects of Language and Translation. Oxford University Press, Oxford, 1998, p. 112.

12. ظہورالدین، پروفیسر، مشمولہ ششماہی مجلہ تسلسل، شعبۂ اردو، جموں یونیورسٹی، جنوری تا جون 2004ء، ص83۔

13. ظہیر احمد صدیقی، پروفیسر، "اردو میں تراجم کے مسائل"، مشمولہ ترجمہ کا فن اور روایت، مرتبہ پروفیسر قمر رئیس، ص79

14. شہباز حسین، مشمولہ ترجمہ کا فن اور روایت، مرتبہ پروفیسر قمر رئیس، ص187

15. محمد حسن، پروفیسر، "ترجمہ: نوعیت اور مقصد"، مشمولہ ترجمہ کا فن اور روایت، مرتبہ پروفیسر قمر رئیس، ص20

16. فیض احمد فیض، "تہذیب وثقافت"، مشمولہ کشاف تنقیدی اصطلاحات، مرتبہ ابوالاعجاز حفیظ صدیقی، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ص55

17. محمد حسن، پروفیسر، مشمولہ کشاف تنقیدی اصطلاحات، مرتبہ ابوالاعجاز حفیظ صدیقی، مقتدرہ قومی زبان,اسلام آباد، ص64

18. عنوان چشتی، پروفیسر، "منظوم ترجمے کا عمل"، مشمولہ ترجمہ کا فن اور روایت، مرتبہ پروفیسر قمر رئیس، ص149

**ماخذ و مصادر :**

- **قرآن مجید**
- باسٹ نیٹ، سوزان۔Translation Studies۔روٹلیج،لندن، چوتھی اشاعت، 2014ء۔
- جالبی، جمیل، ڈاکٹر۔ تنقید اور اسلوب۔ مجلس ترقیِ ادب، لاہور، 1998ء۔
- چشتی، عنوان، پروفیسر۔ "منظوم ترجمے کا عمل" (مضمون)، مشمولہ ترجمہ کا فن اور روایت۔ دہلی، 1976ء۔
- حسن، محمد، پروفیسر۔ "ترجمہ: نوعیت اور مقصد" (مضمون)، مشمولہ ترجمہ کا فن اور روایت۔ مرتب کردہ: پروفیسر قمر رئیس، دہلی، 1976ء۔
- رئیس، قمر، پروفیسر (مرتب)۔ ترجمہ کا فن اور روایت۔ تاج پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 1976ء۔
- سٹینر، جارج۔After Babel: Aspects of Language and Translation۔آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، 1998ء۔
- صدیقی، ابوالاعجاز حفیظ (مرتب)۔ کشاف تنقیدی اصطلاحات۔ مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، 1985ء۔
- صدیقی، ظہیر احمد، پروفیسر۔ "اردو میں تراجم کے مسائل" (مضمون)، مشمولہ ترجمہ کا فن اور روایت۔ دہلی، 1976ء۔
- ظہورالدین، پروفیسر۔ "فنِ ترجمہ نگاری" (تحقیقی مقالہ)۔ ششماہی مجلہ تسلسل، شعبۂ اردو، جموں یونیورسٹی، 2004ء۔
- فتح پوری، فرمان، ڈاکٹر۔ لسانیاتی مباحث اور اردو زبان۔ الوقار پبلشرز، کراچی، 2005ء۔
- فیض، فیض احمد۔ "تہذیب وثقافت" (مضمون)، مشمولہ کشاف تنقیدی اصطلاحات۔ اسلام آباد۔
- نارنگ، گوپی چند، ڈاکٹر۔ ساختیات، پسِ ساختیات اور مشرقی شعریات۔ سنگِ میل پبلیکیشنز، لاہور، 2002ء۔
- نعیمی، عبدالحق، مرزا۔ "فنِ ترجمہ نگاری" (تحقیقی مقالہ)۔ ششماہی مجلہ تسلسل، شعبۂ اردو، جموں یونیورسٹی، 1999ء۔